بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

تیسیر القرآن کا مطالعہ

——— سید جلال الدین عمری

جماعت اسلامی ہند کا قیام ۱۶-۱۸ر اپریل ۱۹۴۸ء کو الٰہ آباد میں عمل میں آیا۔ اس نے اپنے قیام کے بعد ہی سے اس ملک میں دعوت وتبلیغ کی اہمیت شدت سے محسوس کی اور اس کے لیے عملی اقدامات بھی شروع کر دیے۔ اسلام کی دعوت کا ایک موثر ذریعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو مخاطب کے سامنے پیش کیا جائے اور اس پر غور وفکر کی اسے دعوت دی جائے۔ قرآن مجید اسلام کی اساس ہے۔ اس کے مطالعہ سے وہ اسلام کے موقف کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کا صحیح معنیٰ ومفہوم پوری وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے آئے۔ اسلام کے بارے میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں یا اس کی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا قرآن مجید ہی کی روشنی میں جواب دیا جائے۔ جماعت نے طے کیا کہ یہ کام پہلے اردو زبان میں ہو اور پھر اسے ملک کی سرکاری زبان ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اس مشکل اور نازک کام کے لیے جماعت نے اپنے افراد میں سے سب سے بہتر شخص نام ور عالم دین استاذِ محترم مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا انتخاب کیا اور صحیح انتخاب کیا۔ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۱۷ء-۱۹۹۸ء) اس سے پہلے 'اساس دین کی تعمیر' 'فریضۂ اقامتِ دین' اور 'معرکۂ اسلام و جاہلیت' جیسی وقیع کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کے مقالات علمی جرائد ورسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ ان

تصانیف اور مقالات میں انھوں نے قرآن مجید کو جس طرح اپنی تحقیقات کی بنیاد بنایا تھا اس سے قرآن مجید پر ان کی وسیع اور گہری نظر کا ثبوت مل رہا تھا اور وہ علمی حلقوں میں قرآن کے ایک معتبر عالم کی حیثیت سے متعارف تھے۔

تیسیر القرآن کا آغاز اور اختتام

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نے پروگرام کے مطابق 'تیسیر القرآن' کے نام سے تفسیر لکھنی شروع کی اور یہ بالاقساط جماعت اسلامی کے ترجمان ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں شائع ہوتی رہی۔ اس کی پہلی قسط اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء کے مشترکہ شمارہ میں اور آخری قسط اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء کے مشترکہ شمارہ میں چھپی۔ ان قسطوں میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل ہوئی۔

ایک نئی تفسیر کی ضرورت

مولانا نے 'تیسیر القرآن' کے شروع میں مختصر سا مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک نئی تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کے نزدیک موجودہ تراجم و تفاسیر اپنی تمام تر قدر و قیمت کے باوجود مسلمانوں کے ذہن اور ان کی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہیں، ان میں غیر مسلم ذہن کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ اپنی اس تفسیر کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ مولانا کے پیش نظر پورے قرآن مجید کی تفسیر تھی۔ کسی ایک جزء کی تفسیر سے وہ ضرورت جو مولانا نے بیان کی ہے، کسی حد تک ہی پوری کی جا سکتی ہے، صحیح معنیٰ میں اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ انھوں نے موجودہ تفسیر کی کئی ایک آیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس کی تفصیل آئندہ فلاں سورت میں آئے گی۔ یہاں اس کی بعض مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۱۶) ہے:

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّـهٗ قٰنِتُوْنَ○	ان اہل کتاب کا کہنا (یہ بھی) ہے کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ پاک و برتر ہے وہ (اس بات سے) اس کے برعکس (امر واقعہ تو یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، ہر ایک اس کا تابع فرمان ہے۔

اس آیت کے ذیل میں نصاریٰ کے عقیدہ 'مسیح ابن اللہ' پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں: ''ابنیتِ مسیح کی بابت تفصیلی گفتگو سورۂ مائدہ میں اپنے مقام پر آئے گی۔'' حاشیہ (۲۰۲)

۲- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۰) ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ط وَمَا اللّٰـهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ○	پھر اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اپنے پاس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے (سونپی ہوئی) شہادت کو چھپا دے اور اللہ تعالیٰ تمھارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

اس کی تشریح میں مولانا نے بتایا ہے کہ علماء اہل کتاب نے اللہ کی شہادت کو کس طرح تبدیل کیا اور نبی آخر الزماں سے متعلق جو شہادتیں موجود ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ پر سورۂ اعراف کی آیت (۱۵۷) "اَلَّـــــذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ" کے تحت کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ حاشیہ (۲۴۳)

۳- قصاص قتل کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس کا حکم پوری وضاحت اور تاکید کے ساتھ سورۂ مائدہ میں آیا (ہے) جس کی تفصیل اپنے موقع ہی پر آئے گی۔ حاشیہ (۳۱۵)

۴- سورۂ بقرہ آیت (۲۵۸) میں حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے مکالمہ کا ذکر ہے۔ اس کے ذیل میں مولانا نے لکھا ہے ''نمرود خود کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا'' اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اوتار کے نظریہ پر تفصیلی گفتگو سورۂ مائدہ کی ان آیتوں کی توضیح میں آئے گی جن میں اس عقیدہ کا براہِ راست ذکر آیا ہے۔ حاشیہ (۵۵۶)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۲۷۳) میں صدقات کا ایک خاص مصرف یہ بیان ہوا ہے

کہ یہ (ان ناداروں) کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں کچھ اس طرح گھر گئے ہیں کہ اپنی روزی کمانے کے لیے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔

اس کے ذیل میں لکھتے ہیں ''صدقات کے مصارف کئی ایک ہیں جن کی تفصیل سورۂ توبہ آیت (۶۰) میں آئے گی۔ حاشیہ (۵۹۷)

مولانا نے جس نہج پر یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ یہ پایۂ تکمیل کو پہنچتی، لیکن اسے علمی دنیا کا خسارہ ہی کہا جائے گا کہ یہ مبارک سلسلہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر کے بعد منقطع ہوگیا اور ماہ نامہ 'زندگی' میں یہ اعلان شائع ہوا:

> ''بعض وجوہ کی بنا پر ترجمہ وتفسیر کا کام روک دیا گیا ہے، لہٰذا زندگی میں یہ سلسلہ ایک غیر متعین مدت کے لیے ملتوی رہے گا۔'' (ماہ نامہ زندگی، اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء)

اس انقطاع کے متعین اسباب کا پتا لگانا مشکل ہے۔ جہاں تک مولانا کا تعلق ہے انھوں نے اس سلسلہ میں ہمیشہ سکوت اختیار کیا۔ کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کچھ زیادہ اہم کام مولانا اور جماعت کے پیش نظر رہے ہوں جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس سلسلہ کو روک دیا گیا ہو اور بعد میں اسے شروع کرنے کی نوبت نہ آئی ہو۔

مولانا صدرالدینؒ کی یہ تفسیر گو پردۂ خفا میں یا مخطوطہ کی شکل میں نہیں تھی، بلکہ تین سال تک ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں بالاقساط شائع ہوتی رہی، اس کے باوجود یہ ایک علمی ماہ نامہ کا حصہ بن کر رہی۔ ایک محدود حلقہ میں تو اس کا ذکر ہوتا تھا اور اس سے استفادہ بھی کیا جاتا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ مختلف مواقع پر اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علمی دنیا میں اس کی طرف وہ توجہ نہ ہوسکی جس کی وہ مستحق تھی۔ خود مولانا محترم اپنی نجی مجلسوں میں بھی اس کا ذکر نہیں فرماتے تھے۔ اس تفسیر کے بعد متعدد تصانیف مولانا کے قلم سے نکلیں اور قدیم تصنیفات کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں بھی اس کے حوالے نہیں ملتے۔ مولانا نے کبھی اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بہرحال دنیائے علم وادب میں بعض اوقات غیر متوقع

واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ مولانا جیسے نام ور عالم دین کی تفسیر ترپن (۵۳) برس کے بعد اب کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے اور ایک بے مایہ اس پر پیش لفظ لکھ رہا ہے۔

مولانا فراہیؒ کا طریقۂ تفسیر

دورِ حاضر میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کو علوم قرآن میں امامت کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے تفسیر قرآن کی نئی راہیں نکالیں اور قرآن مجید کو اصلاً قرآن ہی سے سمجھنے کی غیر معمولی کوشش کی۔ دیگر ذرائعِ تفسیر کو معاون ذرائع کی حیثیت دی اور اسی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے قرآن مجید کے نظم کو صرف ایک اصول کے طور پر ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے بہت ہی قوی دلائل سے ثابت کیا۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کی ہر سورت کا ایک مرکزی موضوع ہے جس سے پوری سورت کے مضامین مربوط ہیں۔ پھر ان سورتوں کے درمیان بھی ربط ہے۔ اس ربط نے پورے قرآن کو از اول تا آخر ایک مسلسل کلام کی حیثیت دے دی ہے۔

فکر فراہی کی ترجمانی

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ، فراہی اسکول کے ایک نمایاں فرد ہیں۔ انھوں نے 'تیسیر القرآن' میں مولانا فراہیؒ کے طریقۂ تفسیر کی پابندی کی ہے اور ان ہی کے وضع کردہ خطوط پر اسے مرتب کیا ہے۔ مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کی تصنیفات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے مولانا فراہیؒ کی اس وقت تک کی تمام مطبوعہ تحریریں رہی ہیں اور غیر مطبوعہ مواد سے واقفیت کے بھی انھیں مواقع ملتے رہے ہیں اور انھوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مولانا نے اپنے مقدمہ میں استاذ الاساتذہ علامہ حمید الدین فراہیؒ کا بڑے ہی احترام سے ذکر کیا ہے اور ترجمہ و تفسیر میں جو نئے نکات بیان ہوئے ہیں انھیں ان کا بالواسطہ فیض قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ مولانا فراہیؒ کے دو نام ور تلامذہ مولانا اختر احسن

اصلاحیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ ان کے اساتذہ میں شامل رہے ہیں۔ان سے انھوں نے باقاعدہ قرآن مجید کا درس لیا ہے اور مولانا فراہی کی فکر کو سمجھنے اور جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح مولانا فراہیؒ سے مولانا صدرالدینؒ کا صرف ایک واسطہ سے تلمذ کا تعلق رہا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے،البتہ مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب سے مولانا صدرالدین کا تعلق مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں باقاعدہ رہا ہے۔۱۹۵۰ء میں مولانا صدرالدین اصلاحی مرکز جماعت اسلامی ہند رام پور منتقل ہو گئے، لیکن مولانا اختر احسن اصلاحی سے ان کا ربط باقی رہا۔ یہ دونوں حضرات شروع ہی سے جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔۱۹۵۸ء میں مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے انتقال تک ان حضرات کو بار بار ملاقات کا موقع ملتا رہا ہے۔ان میں توقع ہے کہ قرآنی موضوعات اور قرآن کے مشکل مقامات پر بھی تبادلہ خیال ہوتا رہا ہوگا۔(۱)

ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ ماہ نامہ 'زندگی' میں 'تیسیر القرآن' کے شائع ہونے سے پہلے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اسے دیکھ کر اپنے مشورے دیا کرتے تھے لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ ہر قسط کے بارے میں مولانا اختر احسن صاحب کے مشورے حاصل ہوتے تھے یا کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔اس وقت تفسیر جس شکل میں ہے اس سے مولانا اختر احسن مرحوم کی تفسیری آراء ہمارے سامنے بالکل نہیں آتیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا نے کسی بھی آیت کا کیا مفہوم بیان کیا اور مولانا صدرالدین نے اسے قبول کیا یا نہیں؟

(۱) یہ ناچیز جامعہ دارالسلام عمرآباد سے فراغت کے چند ماہ بعد جولائی ۱۹۵۴ء میں مزید استفادہ کے لیے مرکز جماعت اسلامی ہند رام پور پہنچا۔مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم ۱۹۵۸ء میں اپنے انتقال تک مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔شوریٰ سے فارغ اوقات میں اس عاجز کو مولانا اختر احسن مرحوم کی خدمت اور ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے۔مولانا بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ان ملاقاتوں میں بالعموم قرآن مجید ہی تبادلہ خیال اور غور وفکر کا موضوع ہوتا۔اس طرح اس عاجز کو بھی مولانا اختر احسن اصلاحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

فراہی اسکول کی پہلی تفسیر

علامہ حمید الدین فراہیؒ کی دو ایک تحریروں کے علاوہ تمام تصنیفات عربی زبان میں ہیں۔ان میں سے بعض رسائل کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے قلم سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔ان میں آخری پاروں کی بعض چھوٹی سورتوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے تلامذہ بھی اپنے مقالات اور مضامین میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو داں طبقے میں مولانا فراہی کے خیالات عام نہیں ہو سکے تھے۔'تیسیر القرآن' مولانا فراہی کے نہج پر لکھی گئی پہلی اردو تفسیر ہے۔اس کے ذریعہ کم از کم سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی حد تک مولانا فراہیؒ کے خیالات کا باقاعدہ تعارف ہوا۔اس میں شک نہیں کہ مولانا امین احسن کی تفسیر 'تدبر قرآن' میں مولانا فراہیؒ کے خیالات زیادہ تفصیل سے پیش ہوئے ہیں اور وہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تدبر قرآن کے ذریعہ ایک بڑے حلقہ میں اس نہج پر باقاعدہ غور وفکر کا آغاز ہوا، مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تحریریں سامنے آئیں اور ان کے تراجم اور خلاصے شائع ہوئے ،لیکن مولانا صدر الدین اصلاحی اس سے بہت پہلے باقاعدہ تفسیر کا آغاز کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے اسے شرف تقدم حاصل ہے۔'تدبر قرآن' اور 'تیسیر القرآن' میں بعض نکات مشترک بھی ملیں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مولانا فراہی کی تحقیقات پر مبنی ہیں اور دونوں ہی بزرگوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ سے استفادہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کا وسیع اور جامع تصور پیش کیا۔غیر اسلامی افکار ونظریات کی کمزوری واضح کی اور اسلام کو دین حق ثابت کرنے کی بڑی مؤثر کوشش کی۔مولانا مودودیؒ کو اللہ تعالیٰ نے منطقی ذہن، استدلالی قوت اور جان دار قلم عطا کیا تھا۔ انھوں نے وقت کے نمایاں مسائل سے تعرض کیا اور اسلامی فکر کو دلائل کے ساتھ پیش کیا۔

مولانا مودودیؒ کا فکر ان کی تفسیر 'تفہیم القرآن' میں سمٹ آیا ہے۔ وہ اپنی بعض ممتاز خصوصیات کی وجہ سے اس دور کی اردو زبان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر ہے۔اس کا ترجمہ بھی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کو مولانا مودودیؒ کی رفاقت حاصل رہی، انھوں نے مولانا کی وسیع فکر ہی کو نہیں اپنایا بلکہ ۲۶/اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تو انھوں نے آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا۔ان کا شمار جماعت کے بالکل ابتدائی ارکان میں ہوتا ہے۔تقسیم ملک کے بعد وہ جماعت اسلامی ہند کے ایک ممتاز فکری رہنما کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انھوں نے 'تفہیم القرآن' سے اپنی تفسیر 'تیسیر القرآن' میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس طرح تیسیر القرآن میں فکرِ فراہی اور فکر مودودیؒ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔مولانا صدر الدین نے بعض مسائل کی وضاحت کے لیے 'تفہیم القرآن' کے الفاظ مستعار لیے ہیں۔اس کی دو چار مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں:

۱- وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط (البقرۃ:۳۰)

پھر (اس سلسلے میں) اس وقت کو بھی یاد کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔

خلیفہ کے بارے میں تفہیم کا یہ بیان 'تیسیر القرآن' میں نقل ہوا ہے:

''خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے،اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو

من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو
مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے
لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۳۸، ص ۶۲، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۹ء)

مولانا صدرالدین اصلاحی کے قلم سے اس کی مزید وضاحت کے بعد 'تفہیم القرآن' کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں:

''اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں، جنھیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۳۶)

۲- حضرت آدمؑ کی توبہ کا ذکر ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ (البقرۃ:۳۷)

اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے (اور توبہ کی) تو اس نے اس کی توبہ قبول فرمالی یقیناً وہ بڑا ہی معافی دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مولانا مودودیؒ نے وضاحت کی ہے کہ قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہر حال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ (تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۵۲، ص ۶۸)

'تیسیر القرآن' میں یہ پورا نوٹ نقل ہوا ہے۔

۳- آگے ارشاد ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (البقرۃ: ۳۸) تم سب یہاں سے زمین پر جا اترو۔

اس فقرہ پر بھی تفہیم کی عبارت نقل ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کے بعد حضرت آدمؑ پر سے گناہ کا داغ دھل گیا اور وہ زمین میں بھیج دیے گئے تاکہ خلافت کا فریضہ انجام دیں۔ (تفہیم القرآن جلد ا، حاشیہ ۵۳، ص ۶۸)

۴- سورہ بقرہ کی آیت (۲۰۸) کا ایک فقرہ ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ص	اے ایمان والو! (نبی کی) مکمل اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔

اس کی تشریح میں تفہیم القرآن کے حسب ذیل الفاظ لیے گئے ہیں:

''یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریات، تمھارے علوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات اور تمھاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔'' (تفہیم القرآن جلد اول حاشیہ ۲۲۶، ص ۱۶۰)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۲۱۸) میں ایک جگہ ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لا أُولَـٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○	وہ لوگ جو ایمان لائے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے وطن چھوڑے اور جہاد کیا وہ (بجا طور پر) رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں جہاد کے متعلق مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو 'قتال' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں

ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے، جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کردے، اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتیٰ کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے 'جہاد'۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیش نظر نہ ہو۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۲۵۴، ص ۱۶۶، ۱۶۷)

'جہاد' کی یہ پوری تشریح 'تیسیر القرآن' میں نقل ہوئی ہے۔

۶- سود کے سلسلے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَحَلَّ اللّٰـهُ الْبَيْـعَ وَحَـرَّمَ الرِّبٰوا ط (بقرۃ:۲۷۵)	اور اللہ نے تجارت کو جائز ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔

تفہیم القرآن میں اس کی تشریح میں تفصیل سے تجارت اور سود کا معاشی اور اخلاقی لحاظ سے فرق واضح کیا گیا ہے۔ اسے مولانا صدرالدین نے اپنی تفسیر میں شامل کیا ہے۔

مولانا صدرالدین مرحوم نے تفہیم القرآن کے طویل اقتباسات بھی اپنی تفسیر میں لیے ہیں، ان میں تھوڑی بہت ترمیم بھی کی ہے اور کہیں صرف چند جملے اخذ کیے ہیں۔ ان کی کل تعداد بتیس (۳۲) ہے اور یہ تیسیر القرآن کے زیادہ سے زیادہ دس، بارہ (۱۰، ۱۲) صفحات پر مشتمل ہوں گے، لیکن مولانا نے جس فراخ دلی سے اپنے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے وہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

تیسیر القرآن کا اسلوب:

۱-مولانا صدرالدین اصلاحیؒ غیر مسلموں کے پیش نظر تفسیر لکھ رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے، جیسا کہ خود صراحت کی ہے، بہت سے ان مباحث سے گریز کیا ہے، جو عام طور پر تفسیر کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان مباحث سے کسی ایسے شخص کو تو دلچسپی ہو سکتی ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو، لیکن ایک غیر مسلم کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوگی اور وہ اس کے لیے دل چسپی کا باعث نہ ہوں گے۔

۲-مولانا کا قلم بڑا ہی شائستہ اور مہذب ہے۔ کہیں بھی ثقاہت اور سنجیدگی کے منافی کوئی تعبیر بلکہ کوئی لفظ نہیں ملتا۔ ساتھ ہی ان کے ہاں زبان و بیان کا حسن اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے قرآن کے منشا اور مقصد کو صاف ستھرے اور واضح الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب ہیں۔ مولانا صدرالدین کے سامنے قرآن مجید کے سابقہ تراجم رہے ہوں گے، ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہوگا، لیکن انھوں نے جو ترجمہ کیا ہے اس میں قرآن کے الفاظ کی پوری پوری رعایت بھی ہے اور مفہوم کی وضاحت بھی بخوبی ہو رہی ہے۔ اس طرح اس میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس مضمون میں آیات کے ترجمے 'تیسیر القرآن' ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے ترجمہ کے حسن و خوبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۳-مولانا کے نزدیک نظم قرآن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے آیات کے ترجمہ میں اس کی پوری رعایت کی ہے۔ ترجمہ کا مطالعہ کرتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک مربوط اور مسلسل مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نیا مضمون شروع ہوتا ہے یا سابقہ مضمون اور بعد کے مضمون میں بہ ظاہر خلا نظر آتا ہے تو توضیحی کلمات اور حواشی کے ذریعے ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال سورۂ بقرہ کی آیت (۱۷۸) 'كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ' کا حاشیہ ہے۔

اس آیت کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اچانک قصاص کے احکام

بیان ہونے لگے ہیں۔ سابقہ مباحث سے ان کا کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ مولانا نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کا تعلق پوری سورت کے مضمون سے ہے اور اس میں ایک معنوی ترتیب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں ایک ایسے پیغمبر کی بعثت کی دعا کی تھی، جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سنائے، اس کے احکام کی تعلیم دے، حکمتِ دین سمجھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔ اس دعا کے عین مطابق رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ اس سورت کے مضامین کی ترتیب بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہے۔

''اس آیت سے پہلے جو کچھ گزر چکا ہے وہ آیات کی تلاوت کا باب تھا، یعنی اس میں توحید اور قیامت اور رسالت کے بنیادی مسائلِ دینی پر دلیلیں دی گئی ہیں اور اب تعلیمِ احکام کا باب شروع ہو رہا ہے۔'' حاشیہ (۳۱۳)

۴- مولانا نے سورۂ بقرہ کا مرکزی موضوع اثبات رسالت محمدی قرار دیا ہے اور سورہ کے تمام مضامین کو اس سے مربوط دکھایا ہے۔

۵- مولانا نے اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے حسبِ ضرورت قرآن کی آیات اور احادیث سے استشہاد کیا ہے، لیکن بالعموم وہ ان کے اصل الفاظ نقل نہیں کرتے، صرف ترجمہ یا ان کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔

۶- مولانا نے کتبِ تفسیر میں سے کسی مفسر اور محقق کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ و اصطلاحات کی تحقیق بھی کتب لغت کے حوالہ سے پیش نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ پیش نظر مقصد کے لیے یہ کچھ زیادہ سودمند نہ تھی، البتہ کہیں کہیں مفسرین کی مختلف آراء کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اس کی مثالیں دی جا رہی ہیں۔

۱- سورۂ بقرہ کی آیت (۷۳) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کا قتل ہوا۔ قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝	ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ (دیکھو) یوں اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو۔

مولانا فرماتے ہیں: اس مجمل جملہ کی تفصیل کافی دشوار ہے، البتہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ جس گائے کے ذبح کرنے کا اوپر ذکر آیا ہے یہاں اسی کا ذکر ہے۔ وہ اسی حادثہ کے سلسلے میں ذبح کرائی گئی تھی۔ اس کے ایک ٹکڑے سے مقتول کو ضرب لگانے کا حکم تھا۔ اس سے تھوڑی دیر کے لیے مردہ میں جان آ گئی اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتادیا۔ حاشیہ (۱۳۳)

۲- ہاروت و ماروت کے ذیل میں ارشاد ہے:

وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ

(البقرۃ:۱۰۲)

نیز اس چیز کی پیروی میں (منہمک ہوگئے) جو بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی (ان فرشتوں کا حال یہ تھا کہ) جب بھی کسی کو اپنا یہ فن سکھلاتے تو پہلے سے اس کو متنبہ کر دیتے کہ ''دیکھو! ہم تو آزمائش ہیں سو تم ہمارا (یہ آزمائشی فن سیکھ کر ہرگز) کفر کی راہ نہ اختیار کرنا'' (مگر اس تنبیہ کے باوجود یہ کج فطرت لوگ) ان سے وہ چیز سیکھتے رہے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالنے لگے۔

ہاروت و ماروت کو جو علم دیا گیا تھا مولانا نے ترجمہ و تشریح کے ذریعے اس کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ہمارے اکثر مفسرینِ قرآن نے اس علم کو بھی جو ان دونوں فرشتوں کے ذریعے بنی اسرائیل کو سکھایا گیا تھا، جادو ہی کا علم قرار دیا ہے۔ مگر یہ بات متعدد وجوہ سے صحیح نہیں۔ ایک تو یہ کہ واو عطف کے ذریعے دو الگ الگ چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جادوگری کی وبا تو یوں ہی ان میں پھیلی ہوئی تھی، پھر اس جدید اہتمام کی کیا حاجت تھی؟ تیسرے فرشتوں کو ایک کارِ حرام کے لیے بھیجا جانا کچھ غیر مناسب سی بات ہے۔ چوتھے فتنہ کا

اصل مفہوم جس کی توضیح ہم اوپر کر چکے ہیں، کسی طرح جادو اور شعبدہ کی تاویل کو قبول نہیں کرتا۔'' حاشیہ (۱۷۸)

۳- حج کے سلسلے میں ایک ہدایت یہ کی گئی ہے:

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ (البقرۃ:۱۹۶)

لیکن اگر (کہیں راستے ہی میں) گھر جاؤ تو جو قربانی کا جانور میسر آئے (اللہ کی جناب میں پیش کرو) اور (اس وقت تک) اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک کہ وہ جانور اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔

اس کے ذیل میں مولانا فرماتے ہیں: ''جگہ سے مراد بعض علماء کے نزدیک کعبہ کے اردگرد کی وہ زمین ہے جہاں حج میں قربانیاں کی جاتی ہیں، اور بعض کے خیال میں یہ وہی جگہ ہے جہاں آدمی گھر گیا ہو۔ پہلا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ورنہ ''پہنچنے'' کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا۔ اب جو جانور اسے میسر آیا ہو خواہ اونٹ یا گائے یا بھیڑ یا بکری، اس کو کعبہ تک بھیجنے کی شکل یہ ہوگی کہ کسی جانے والے کے ہم راہ کر دے یا اس کو قیمت دے کر کہہ دے کہ وہاں پہنچ کر جانور خرید لینا اور میری طرف سے ذبح کر دینا۔ ذبح کرنے کا وقت بھی بتا دے اور جب یہ وقت آ جائے تو سر منڈا کر احرام کھول لے۔ اب آئندہ سال اس حج کو، جس کی نیت کی تھی مگر موانع کی وجہ سے ادا نہ کر سکا، از سرِ نو ادا کرے۔ حاشیہ (۳۷۰)

علمی مباحث:

تیسیر القرآن میں جگہ جگہ بڑے قیمتی مباحث اور خوب صورت تشریحات ملتی ہیں۔

۱- تفسیر کے شروع ہی میں 'اللہ' کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

'' 'اللہ' اسم ذات ہے اس ہستی کا جو تمام کائنات کی پیدا کرنے والی، دیکھ بھال کرنے والی اور براہ راست سب پر فرماں روائی کرنے والی ہے۔ وہ ہر کمال سے متصف اور ہر جمال کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنی صفات

میں یکتا اور بے مثل ہے۔ اس کو کسی چیز سے، کسی حیثیت سے بھی تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ وہ نہ تو جسم رکھتا ہے، نہ کوئی جسمانی قالب اختیار کرتا ہے، نہ کوئی چیز اس سے، یا وہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود، ہر شے سے واقف، ہر امر پر قادر ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک، ہر چھوٹی بڑی چیز اسی کی، اور صرف اسی کی محکوم ہے اور سب اس کے سامنے یکساں طور پر عاجز اور بے بس ہیں۔'' حاشیہ (۱)

اس کی مزید وضاحت ایک اور جگہ ہمیں ملتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۳۳) میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے انتقال کے وقت اپنی اولاد سے سوال کیا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ ؟ اس کے جواب میں ان کی اولاد نے کہا:

نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ آبَائِکَ — ہم آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے معبود کی بندگی کریں گے۔

مولانا نے 'الٰہ' کا پورا مفہوم، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''وہ جس کے آگے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے، جس سے دعائیں مانگی جائیں، جس سے حاجتیں طلب کی جائیں، جس کی پناہ ڈھونڈی جائے، جسے نفع اور نقصان کا مالک سمجھا جائے اور جو اپنے بالاتر اقتدار کی بنا پر اس کا مستحق ہو کہ انسان اس کی بندگی و اطاعت کرے اور اس کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرے۔'' حاشیہ (۲۳۱)

۲- ابلیس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ (البقرہ:۳۴)

مولانا فرماتے ہیں:

''ابلیس کے معنی ہیں انتہائی مایوس۔'' آگے چل کر فرماتے ہیں ''اس کا دوسرا نام شیطان بھی ہے، جس کے لفظی معنی ہیں 'ہلاک و نابود ہونے والا' یا 'دور ہونے والا'۔''

شیطان کے بارے میں ایک غلط خیال یہ ہے کہ اس کا کوئی متعین وجود یا شخصیت

نہیں ہے بلکہ وہ انسان کے اندر پائی جانے والی سرکش قوتوں کا نام ہے۔ مولانا کے نزدیک شیطان اور ابلیس کے الفاظ ہی اس غلط خیال کی تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''ان الفاظ کے بعد غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابلیس یا شیطان محض کسی مجرد قوت کا نام ہے بلکہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی مستقل شخصیت رکھتی ہے۔'' حاشیہ (۵۳)

ابلیس کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار واضح ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ابلیس کے اس واقعہ سے اسلام کے تصور توحید کے متعلق ایک بڑی اہم حقیقت روشنی میں آتی ہے۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرنا ہی توحید کا کل مفہوم ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ابلیس سے بڑا موحد کون ہوسکتا تھا کہ فرمانِ خداوندی کے بعد بھی اس نے غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی ''موحدانہ'' کارنامہ پر فاسق اور کافر قرار دے دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے تشریعی احکام کی اطاعت بھی جزوِ توحید ہے۔ اگر عقل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کا بدیہی فیصلہ بھی یہی ہوگا۔'' حاشیہ (۵۳)

۳- اللہ تعالیٰ نے سینا کے چٹیل میدان میں بنی اسرائیل پر بدلیوں کا سایہ کیا اور من وسلویٰ اتارا۔ (البقرہ:۵۷)

اس پر بحث کے ذیل میں مولانا نے اللہ کی رحمت کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے کہ ''انسان کا کام میری بندگی کرنا ہے اور اس کی روزی فراہم کرنے کا بار مجھ پر ہے۔'' جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار کا مرکز اللہ کی بندگی اور رضا جوئی ہونی چاہیے نہ کہ معاشی ضروریات و مادی ذرائع کی فراہمی۔ یہ کام دراصل دنیا کے پالن ہار کا ہے کہ اپنی چاکری کے کاموں میں مشغول بندوں کو روزی مہیا کرے۔

پس جو شخص یا گروہ خدا کی رضا جوئی میں جس حد تک منہمک ہوگا مخلوق کا پالنے والا روزی کمانے کی ذمہ داریاں اسی حد تک اس پر سے ساقط کردے گا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں روزی حاصل ہونے کے عام اسباب کا پردہ بھی بیچ سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ جس کی واضح مثال یہ من وسلویٰ کا نزول ہے۔" حاشیہ (۱۰۵)

۴- آگے اسی حقیقت پر آیت (۶۱) کے ذیل میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کی جگہ زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں عطا کرے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ	کیا تم ایک بہتر چیز کو ادنیٰ شے سے بدلنا چاہتے ہو؟

اس کا مطلب بالعموم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ من وسلویٰ کے مقابلہ میں کم تر درجہ کی یا بے حیثیت چیزیں ہیں۔ تم ایک بہتر چیز کے مقابلہ میں کم تر چیز کی مانگ کر رہے ہو لیکن مولانا نے اس کا ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے جو زیادہ بامعنیٰ ہے:

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ من وسلویٰ جیسی مزے دار اور بلا مشقت حاصل ہونے والی چیزوں کو چھوڑ کر ایسی چیزیں مانگ رہے ہو جو کم لذیذ ہیں یا پسینہ بہانے کے بعد ہی مل سکتی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انتظام تمھیں فکر معاش سے آزاد کیے ہوئے ہے۔ ان حالات میں تمھیں اس کا ممنون کرم ہوتے ہوئے دعا کرتے رہنا چاہیے تھا کہ پروردگار! کرم کی یہ نگاہ یوں ہی باقی رہے تاکہ ہم ان مادی ضروریات کی فکر سے آزاد ہو کر اپنے زندگی کے اصل مقصد کے حصول میں پوری طرح مشغول رہیں اور ہمارا کام اس کے سوا اور کچھ نہ رہ جائے کہ ایک طرف تو

تیرے پیغمبر کے فیضِ تربیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا دل پاک کریں، اپنے اخلاق سدھاریں، دین اللہ کی معرفت بڑھائیں اور اچھے اعمال کا نمونہ بن جائیں، دوسری طرف تیرے نورِ ہدایت کو لے کر آگے بڑھیں اور کفر و شرک سے تاریک فضاؤں میں اسے پھیلا دیں۔ پر افسوس ہے تمھاری پست نگاہی پر کہ بچوں کی طرح زبان کے چٹخاروں پر ریجھے جا رہے ہو۔ لذت پرستی کی ذلیل ذہنیت نے تمھیں زندگی کے پاک اور اصل مقصد سے اس درجہ بے گانہ کر رکھا ہے۔" حاشیہ (۱۱۴)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۹۹) کے الفاظ ہیں:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۚ	ہم نے تمھاری طرف ایسی آیتیں نازل کی ہیں جن کا آیات الٰہی ہونا بالکل روشن ہے۔ ان کا انکار صرف فاسق ہی کر سکتے ہیں۔

اس کی تشریح میں مولانا نے اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے کہ:

"قرآن دنیا کے ان تمام لوگوں کو یکساں طور پر فاسق قرار دیتا ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کی ذمے داری دنیا کے کسی شخص پر اس وقت عائد ہوتی ہے جب وہ اس سے واقف ہو جائے اور اس کی دعوت اس تک پہنچ جائے۔ اس سے قبل وہ اس امر خاص میں خدا کے حضور جواب دہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن پر ایمان کیوں نہیں لایا۔۔قرآن سے ناواقف فاسق نہیں بلکہ دراصل قرآن کا منکر فاسق ہے۔ یعنی وہ دشمن حق جس کو قرآن کی دعوت پہنچ چکی لیکن وہ ایمان نہیں لایا بلکہ وہ بدستور نفس پرستی، آبائی تقلید یا نسلی یا قومی عصبیت کا شکار بنا رہا۔" حاشیہ (۱۷۰)

۶- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۰۶) میں نسخ کا ذکر ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنسِهَانَاتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ○

ہم (اپنی نازل کردہ) جس آیت کو بھی منسوخ کردیتے ہیں تو اس کے بجائے اس سے بہتر آیت، اور جس آیت کو بھلوا چکے ہوتے ہیں (اوراب اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے) تو اس کی جگہ ویسی ہی آیت نازل کردیتے ہیں۔کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اللہ ہر بات کی قدرت رکھتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے دو باتیں کہی ہیں۔ایک یہ کہ شریعت کے بعض احکام پہلے دیے گئے تھے وہ بعد میں منسوخ کردیے گئے تو فتنہ پرداز اعتراض کرنے لگے کہ کیا نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ سے غلطی ہوگئی تھی جس کی بعد میں اصلاح کی گئی۔آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔اس کی وضاحت کے لیے بعض حضرات نے شریعت کے قانون نسخ کی تفصیل پیش کی ہے۔آیت کے ذیل میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس میں یہود کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔اعتراض یہ تھا کہ توریت اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے۔پھر قرآن اس کے بعض احکام کو کیوں منسوخ قرار دیتا اور اس کی جگہ دوسرے احکام پیش کرتا ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن من جانب اللہ نہیں ہے، ورنہ اللہ کی ایک کتاب دوسری کتاب کے قوانین پر اس طرح خطِ نسخ نہ پھیرتی۔آیت میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔(تفسیر ابن کثیر:۱/۱۵۰-۱۵۱)

دوسری بات آیت کے سیاق وسباق سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔مولانا صدرالدین مرحوم نے یہی رائے اختیار کی ہے اور اتنی تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے شاید کسی اور نے اس تفصیل سے بحث نہیں کی ہے۔ملاحظہ ہو۔حاشیہ (۱۸۶)

۷-حج کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَ اتَّقُوْنِ يٰاُولِى الْاَلْبَابِ ط (البقرة:۱۹۸)

(تقویٰ کا) زادِراہ جمع کرو کہ بہترین زادِراہ یہی تقویٰ ہے۔لہٰذا اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حج کے سلسلے میں سفر کی ضروریات کا اہتمام کیا جائے، بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے یعنی یہ کہ آدمی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور ان پر بوجھ نہ بنے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود حج کے سیاق سے بہت زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔ مولانا نے اس کی تشریح ایک نئے ڈھنگ سے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہل عرب:

> ''حج'' کرنے کثرت سے آتے مگر حج کا مقصود کب کا بھلا چکے تھے، سچی خدا پرستی کی روح سے ان کا حج بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ''حج'' کرنے آتے مگر دنیا کمانے کی غرض سے، تجارتی منافع بٹورنے کے لیے اور سیر و تفریح کی خاطر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عبادتیں آخرت کی پونجی جمع کرنے کے لیے ہیں، نہ کہ دنیا کمانے کا آلہ۔ اس لیے حج کرنے آؤ تو پیش نظر خدا پرستی کی روح پیدا کرنا ہو، تقویٰ کی روشنی سے دل کو منور کرنا ہو، آخرت کی سعادت اور فیروز مندی کے لیے خوش نودیِ رب کا ذخیرہ جمع کرنا ہو۔ معلوم ہوا کہ دوسرے احکام شرع کی طرح حج کا مقصد بھی اللہ کا تقویٰ پیدا کرنا ہے، وہ تقویٰ جو قرآن سے ہدایت پانے کی ایک ہی شرط ہے۔''
> حاشیہ (۲۸۰)

آیت کے آخر میں ارشاد ہے کہ (اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو) اس سے مولانا نے بہت عمدہ نکتہ نکالا ہے کہ:

> ''یہ اور اس طرح کی بہت ساری آیتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین اور تقویٰ عقل کا تقاضا ہیں، اور بنی نوع انسان کی عقل ہی اس ذمے داری کی بنیاد ہے۔ قرآن ان لوگوں کے نظریہ کی پرزور تردید کرتا ہے، جن کا خیال ہے کہ دین کا عقل سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف دل کے لطیف احساسات کی پیداوار ہے۔'' حاشیہ (۲۷۹)

۸- قرآن مجید نے انسانوں کے اُمت واحدہ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّـــةً وَّاحِـــــدَةً (درحقیقت) سارے انسان (ہمیشہ سے)
(البقرة: ۲۱۳) ایک ہی گروہ ہیں۔

اس آیت کا مفہوم مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ تمام انسان آغاز میں ایک امت تھے اور ان کا دین بھی ایک تھا۔ پھر ان میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اختلافات کو ختم کرنے اور حقیقت حال کو واضح کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ یہ اختلافات بعد کی پیداوار ہیں جو دنیا کی طلب اور ظلم وعدوان کی وجہ سے رونما ہوئے، لیکن مولانا اسے یہاں ماضی کی جگہ ایک حقیقت واقعہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آیت میں بتایا گیا ہے کہ سارے انسان اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہیں اور ان کا دین بھی ہمیشہ ایک رہا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود دنیا کی طلب میں اختلافات رونما ہوتے رہے اور پیغمبروں نے اس کی اصلاح کا فرض انجام دیا۔ مولانا نے اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

’’(درحقیقت) سارے انسان (ہمیشہ سے) ایک ہی گروہ ہیں اور (سب کے لیے ایک ہی دین ہے لیکن دنیا پرستی کی وجہ سے ان میں اختلافات رونما ہوگئے) تو اللہ نے (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی پر) ڈرانے والے پیغمبر بھیجے، اور ان کے ساتھ پیغام حق رکھنے والی کتاب نازل فرمائی، تاکہ وہ ان اختلافات کا فیصلہ کردے جس میں لوگ مبتلا ہوچکے تھے۔ اور (امر حق میں) یہ اختلافات ان ہی لوگوں نے کیے جن کو یہ حق بخشا جاچکا تھا (اور اس وقت کیے تھے) جب کہ روشن ہدایتیں ان کے پاس آئی ہوئی تھیں، (صرف) آپس میں (ایک دوسرے پر) زیادتی کرنے کی خاطر (انھوں نے ایسا کیا)۔ پس (اس وقت) جو لوگ (نبی پر) ایمان لائے، اللہ نے انھیں اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگ مختلف الرائے ہوگئے تھے۔ اللہ (اپنی حکمت اور سنت کے مطابق) جس کو چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے۔‘‘

مولانا نے حواشی میں اس کی جو تشریح کی ہے وہ بڑی قابل قدر ہے۔ فرماتے ہیں:

''قرآن کی یہ آیت ان بہت ساری آیتوں میں سے ایک ہے جو اعلان پر اعلان کرتی ہیں کہ سارے انسانوں کو ہمیشہ سے ایک ہی دین عنایت ہوتا رہا ہے۔ اصل دین میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہوا۔'' حاشیہ (۴۰۶)

۹- آیت الکرسی (البقرہ: ۲۵۵) قرآن مجید کی بڑی اہم آیت ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے اس کی تفسیر میں شفاعت کے صحیح اور غلط تصور کی نہایت عمدہ وضاحت کی ہے۔

''جہاں قرآن نے اس شفاعت کی تردید کی ہے، جس کے مشرکین قائل تھے اور ہیں وہیں شفاعت کا اثبات بھی کیا ہے۔''

دونوں طرح کی شفاعتوں کے فرق کو مولانا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''قرآن اس نظریۂ شفاعت کو رد کرتا ہے جو انسان کو عقیدۃً وعملاً خدا کے مقابلہ میں کسی مخلوق کے قریب لے جائے، اور اس تصور شفاعت کی توثیق کرتا ہے جو اسے ہر ماسوا کے مقابلہ میں خدا سے قریب کرے۔'' حاشیہ (۵۴۳)

اس کی وضاحت آگے اس طرح کی ہے کہ:

''پہلا نظریہ انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ تیری فلاح اور بخشش عملی طور پر اصلاً فلاں بزرگ اور فرشتے (اور کسی) مخلوق کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ وہ بالذات تیری بخشش کا مالک اور صاحب امر نہیں، بلکہ اصل صاحب امر کے دربار میں بڑا زور اور اثر رکھتا ہے۔''

''اس کے بالمقابل دوسرا قرآنی تصور شفاعت انسان کو اس ٹھوس حقیقت سے دوچار کراتا ہے کہ سارا اقتدار اور فیصلے کا حق صرف خدا کو ہے۔ سب اس کے دربار میں یکساں مجبور ہیں۔ اس کے حضور زبان کھولنے کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بولنے کی اجازت دے اور دوسرے

یہ کہ جو بات کہی جائے بالکل ٹھیک مطابق واقعہ کہی جائے، اسی لیے اگر کوئی شخص قیامت کے دن کسی کی شفاعت کرے گا بھی تو اس کی حیثیت صرف دعا اور التجا کی ہوگی اور وہ بھی اس وقت جب داورِ حقیقی اس کی اجازت دے۔"

عقلی انداز

مولانا صدر الدین اصلاحی کا اسلوب عقلی اور استدلالی ہے۔قرآنی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں انھیں رفع کرنے کی انھوں نے نہایت عمدہ کوشش کی ہے اور عقل کو مطمئن کرنے والے دلائل فراہم کیے ہیں۔لیکن اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ عام طور پر جن اصحابِ فکر پر عقلیت کا غلبہ ہوتا ہے وہ ان تمام امور کی توجیہ کرنے لگتے ہیں جنھیں وہ خلاف عقل سمجھتے ہیں۔خواہ قرآن مجید کے الفاظ اس کا ساتھ دیں یا نہ دیں۔اس کی زد میں بعض اوقات ملائکہ، جن اور شیاطین، وحی و رسالت اور برزخ جیسے حقائق اور ایمانیات بھی آجاتے ہیں۔اسی میں انبیاءؑ کے معجزات بھی شامل ہیں۔مولانا کی تفسیر اس مرعوبیت سے پاک ہے۔ان تمام امور میں ان کے سامنے اصلاً الفاظِ قرآن رہے ہیں اور انھوں نے وہی تفسیر اختیار کی ہے جو قرآن کے الفاظ سے ہم آہنگ ہو یا جن کی الفاظ میں گنجائش ہو۔اس سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی ہے۔اسے بعض مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

۱- حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے لیے بحر احمر کے شق ہونے کا ذکر سورۂ بقرہ آیت(۵۰) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝

(یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے تمھارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور پھر (درمیان سے) تمھیں صحیح سلامت گزار دیا تھا، لیکن فرعونیوں کو تمھاری نگاہوں کے سامنے غرق کردیا۔

اس کے ذیل میں مولانا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے:

''اس موقع پر جب کہ کوئی انسانی تدبیر ممکن نظر نہیں آتی تھی، اپنے معمولی قوانین کے بجائے غیر معمولی قوانین کا حکم دیا اور سمندر یکا یک اس طرح پھٹ گیا کہ بیچ میں خشک گزرگاہ نمودار ہوگئی اور دائیں بائیں پانی کی پہاڑیاں نصب ہوگئیں۔ حضرت موسیٰ مع اپنی پوری قوم کے خدا کا نام لے کر اس گزرگاہ سے ہوتے ہوئے دوسرے ساحل پر جا پہنچے۔ فرعون نے جو تعاقب کرتا ہوا اب ساحل پر پہنچ چکا تھا، سمندر کے بیچ سے انسانی گروہ کو گزرتے دیکھ کر خود بھی اپنا گھوڑا ڈال دیا، جب پورا لشکر اتر چکا تو دائیں بائیں کی 'آبی پہاڑیاں' باہم مل گئیں اور دیکھتے دیکھتے پورا لشکر غائب تھا'' حاشیہ (۹۳)

۲-سورۂ بقرہ کی آیت (۶۰) کے الفاظ ہیں:

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

(یاد کرو وہ وقت) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی درخواست کی تھی اور ہم نے کہا تھا کہ 'اپنی لٹھیا فلاں چٹان پر مار' چناں چہ (لٹھیا کا مارنا تھا کہ) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ کو یہ معلوم (بھی) ہوگیا کہ اس کے پانی لینے کی جگہ کون سی ہے۔

مولانا نے اسے بھی غیر معمولی اور غیر عادی واقعہ قرار دیا ہے۔

''سایہ اور غذا کی طرح پانی کا بھی غیر معمولی طور سے انتظام کیا گیا۔ بالکل معجزہ کے طور پر چٹان کا سینہ چاک ہوا اور پانی ابل پڑا، اور اس انداز سے ابلا کہ اگر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے تو چشمے بھی بارہ ہی پھوٹے تا کہ پانی کی یہ تقسیم بھی خدا ہی کی طرف سے ہوجائے۔'' حاشیہ (۱۰۹)

اس کے بعد مولانا نے ان حیرت انگیز اور غیر عادی واقعات کی حکمت بھی بیان

فرمائی ہے۔

۳- بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے سبت کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی، اللہ نے ان کو جو سزا دی اس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (البقرۃ:۶۵)	چناں چہ تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ بہ خوبی معلوم ہے جنھوں نے سبت کے معاملہ میں سرکشی اختیار کر لی تھی اور ہم نے (بطور عذاب) ان سے فرما دیا تھا کہ بن جاؤ بندر، ذلیل اور دھتکارے ہوئے۔

اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ شکل وصورت کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ذہن و مزاج کی تبدیلی تھی، لیکن مولانا کہتے ہیں:

> ''ہوسکتا ہے کہ ان کی صورتیں نہ بدلی ہوں صرف باطن مسخ ہو کر بندروں جیسا ہو گیا ہو یا یہ صرف ایک مجازی تعبیر ہو ان کے ذلیل وخوار ہو جانے کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظاہراً و باطناً دونوں حیثیتوں سے مسخ کر کے بالکل بندر بنا دیے گئے ہوں اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ دماغ تو انسانوں جیسا دیا گیا ہو مگر صورتیں مسخ کر دی گئی ہوں۔ یہی آخری شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس شکل میں خود ان کو بھی اپنے ذہن میں یہ محسوس کرتے رہنے کا موقع تھا کہ یہ سب کچھ ہماری شرارتوں کا نتیجہ ہے۔'' حاشیہ (۱۲۶)

۴- بعض لوگ عالم برزخ کا انکار یا اس کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کے منافی سمجھتے ہیں، حالاں کہ برزخ کی زندگی قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مولانا صدرالدین کے ہاں وضاحت کے ساتھ برزخ کے عقیدہ کا ذکر ہے اور اس پر سورۂ بقرہ کی آیت (۱۵۴) سے استدلال کیا ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّ لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط

ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں لیکن تمھیں (ان کی زندگی) کا شعور نہیں۔

مولانا لکھتے ہیں:

''قرآن اور حدیث دونوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان بالکل ایسا مردہ نہیں ہو جاتا کہ اس کو حیات سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو اور جب قیامت آئے گی اسی وقت جا کر اسے اس کامل حالتِ مرگ سے نکال کر دوبارہ زندگی عطا کی جائے گی، بلکہ اس دوران میں بھی اس کو ایک طرح کی جزوی زندگی حاصل رہتی ہے، جسے برزخی زندگی کہتے ہیں۔ اس زندگی میں بھی ہر شخص پر اس کے اعمال کے مطابق جنتی نعمتوں اور لذتوں کا یا پھر دوزخی مصیبتوں اور کلفتوں کا ترشح ہوتا رہتا ہے۔ یہاں اس آیت میں اسی زندگی کا ذکر ہے۔'' حاشیہ (۲۷۵)

۵- سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۹) میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الموت کا تجربہ کرایا تھا۔

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّ ھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ج قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ج فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ط قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ ج وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ قف وَ

یا کیا اس شخص کے حال پر تم نے غور نہیں کیا جس کا گزر ایک بستی پر سے ہوا تھا، جو اپنی چھتوں کے بل ڈھی پڑی تھی؟ (اسے دیکھ کر بے اختیار) اس کے منہ سے نکلا: ''یوں ہلاک ہو جانے کے بعد اللہ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ نے سو برس کے لیے اس پر موت طاری کر دی، پھر اس کو (زندہ) اٹھا کھڑا کیا۔ دریافت کیا: ''تم (یہاں) کتنی دیر رہے؟'' بولا: ''ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ'' فرمایا: (نہیں) بلکہ تم

لِنَجْعَلَکَ آیَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَکْسُوْهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ لا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

(البقرۃ:۲۵۹)

(یہاں اس حالت میں پورے) سو برس رہے ہو۔ سو اب ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کا جائزہ لو کہ ان پر سالہا سال گزر جانے کا کوئی اثر نہیں، دوسری طرف اپنے گدھے کو دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)۔ (ہم نے تمھیں اپنی قدرت کا مشاہدہ اس لیے کرایا ہے تاکہ تم کو نورِ یقین حاصل ہو) اور اس لیے تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے واسطے (بھی) ایک نشانی بنا دیں۔ اور پھر دیکھو کہ ہم کس طرح ہڈیوں کو اٹھا کر (ان کا ڈھانچہ بناتے اور) پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔'' جب اس کے سامنے حقیقت یوں بے حجاب ہوگئی تو بول اٹھا: ''مجھے یقین ہے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

بعض لوگوں کو اسے بھی غیر عادی اور معجزانہ واقعہ ماننے میں تأمل ہوسکتا ہے، لیکن مولانا نے اسے ایک غیر عادی واقعہ ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس ہستی پر اللہ نے موت طاری کردی:

> ''ہوسکتا ہے کہ انھیں بالکل مردہ حالت میں رکھا گیا ہوا اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان پر ایک طویل نیند طاری کردی گئی ہو۔ قرآن میں نیند کے لیے موت کا استعمال یا استعارہ نایاب نہیں گو کم یاب ضرور ہے۔''
>
> حاشیہ (۵۶۰)

یہ بات کہ سو برس گزرنے کے باوجود کھانے پینے کی چیزیں جوں کی توں رہیں اور دوسری طرف گدھے کا ڈھانچہ بوسیدہ ہو چکا تھا، اس پر مولانا لکھتے ہیں:

> ''گویا جس چیز پر موسمی حالات اور تغیرات کا نیز امتداد وقت کا اثر نسبتاً کچھ دیر میں ہوتا ہے (یعنی جانور) وہ تو یوں گل سڑ چکی تھی، مگر جس پر یہ اثر بہت جلد ہوتا ہے (یعنی کھانا یا پانی) وہ بدستور تر و تازہ موجود تھی۔ یوں اگر ایک شے اس امر کی شاہد تھی کہ یہاں کا قیام ایک لمبی مدت کا قیام ہو چکا

ہے، تو دوسری اس حقیقت کی گواہ تھی کہ قوانین قدرت اور عناصر فطرت اپنے فعل و تاثیر میں آزاد اور مستقل نہیں ہیں، بلکہ کسی بالاتر قوت (یا) قدرت الٰہی کے تابع فرمان ہیں، لہٰذا ضروری نہیں کہ عام قانونِ حیات کسی شے کو اپنے ضابطہ کے تحت فنا کی منزل پر پہنچا ہی دے اور جب یہ امر واقعہ ہے تو پھر کیا فرق ہے اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت جب چاہے قوانین فطرت کو ان کے اپنے عمل سے روک دے اور اس بات میں کہ یہی قدرت عناصر طبیعت کو اس شے کی واپسی کا حکم دے دے، جس کے اجزاء بکھر کر ان کے معدوں میں جذب یا مستور ہو چکے ہیں۔ اور پھر یہ بکھرے ہوئے اجزاء اس کے حکم سے از سر نو سمٹ کر ایک مکمل قالب اور حسب سابق ایک زندہ جسم کی شکل میں تبدیل ہو جائیں۔'' حاشیہ (۵۶۲)

بعض اختلافی مسائل

مولانا صدرالدین نے اپنی تفسیر میں بعض اختلافی مسائل سے بھی تعرض کیا ہے۔ قرآن مجید نے منکرین حق کے بارے میں فرمایا (خٰلِدِيْنَ فِيْهَا) کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جب تک جہنم رہے گی۔ رہی یہ بات کہ جہنم کب تک رہے گی تو اس کی بابت قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ جب تک اللہ چاہے گا۔'' (ہود: ۱۰۷)، حاشیہ (۶۷)

اس سے خیال ہوتا ہے کہ مولانا غالباً جہنم کو ابدی نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض علماء کی یہ رائے ہے، لیکن عام علماء اور محققین کے نزدیک جنت کی طرح جہنم بھی ابدی ہے۔

۲- اسلام کے جن احکام و مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان میں ایک قتل مرتد کا مسئلہ بھی ہے۔ اسے آزادیٔ فکر کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی گئو سالہ پرستی اور اس پر ان کی سزا کا ذکر سورۂ بقرہ (۵۴) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

(یاد کرو وہ وقت) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر یقیناً اپنے اوپر (سخت) ظلم کیا ہے، پس اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنے (اندر کے مجرموں) کو قتل کر ڈالو، اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بھلائی ہے۔" چناں چہ (اس وقت ایسا ہوا تھا کہ تمھاری عفو خواہی پر) اس نے تمھاری توبہ قبول فرمالی بلاشبہ اس کی درگزر اور رحم فرمائی بڑی بے پایاں ہے۔"

مولانا صدرالدین اصلاحی نے (فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ) کا جو ترجمہ کیا ہے بالعموم مفسرین نے ان الفاظ کے یہی معنی لیے ہیں۔ اس کے حاشیہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"یعنی جن لوگوں نے اس شرک کا ارتکاب کیا ہے انھیں قانون شریعت کے مطابق ارتداد کی سزا دی جائے اور قتل کر دیا جائے۔" حاشیہ (۹۷)

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ توریت یا موسوی شریعت میں مرتد کی سزا قتل تھی، کیا توریت میں اب بھی یہ حکم موجود ہے؟ اس کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کرسکتا، لیکن اگر یہ ثابت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آخری رسول محمد ﷺ کی شریعت نے اس حکم کو باقی رکھا جو پہلے سے توریت میں موجود تھا۔

۳- دیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

"آزاد، غلام اور عورت میں سے ہر ایک کے خون کی قیمت کیا ہوگی تو شریعت نے اس کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے بلکہ اسے دستور عام پر چھوڑ دیا ہے۔ جس ملک یا سوسائٹی میں اہل الرائے کے درمیان جو قیمتیں طے قرار پا جائیں، شریعت کے نزدیک وہی قیمتیں قابل تسلیم ہوں گی۔" حاشیہ (۳۶)

عام طور پر علماء نے حدیث کی بنیاد پر دیت سو اونٹ مانی ہے۔ اونٹ کی قیمت بھی

ادا کی جا سکتی ہے۔ آزاد، غلام اور عورت کی دیت میں کوئی فرق ہے یا نہیں، اس پر بھی اہل علم نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ مولانا کی اس رائے کو ایک صاحب علم کی رائے کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اصلاح امت

مولانا کی تفسیر کا انداز خالص علمی ہے۔ اس میں ملکی و غیر ملکی حالات، سیاسی تغیرات اور امت کے مسائل کا ذکر نہیں ملتا، لیکن کہیں کہیں امت کی کم زوریوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور اصلاح حال کی دعوت دی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز ہی میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ) یعنی یہ سراپا ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے اندر تقویٰ ہے۔

مولانا نے تقویٰ کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس کے آغاز میں فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد انسان کے دل کی وہ کیفیت ہے جو اس کو ہر لحہ اس بات پر آمادہ رکھتی ہے کہ وہ اپنے محسن حقیقی کے احسانوں کو یاد رکھے، ان کے تقاضوں سے غافل نہ ہو۔

اس کے بعد قرآن نے متقیوں کی صفات بیان کی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ”قرآن نے یہاں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس پر انھیں (مسلمانوں کو) گہری نظر ڈال کر محسوس کرنا چاہیے کہ ہدایت کا مفہوم کتنا وسیع ہے، اور کس طرح وہ پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہدایت صرف اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی بس خدا اور آخرت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کردے اور جوں توں کر کے نماز پڑھ لے اور زکوۃ دے دے، بلکہ اس کا تعلق انسان کی زندگی کے ایک ایک شعبے اور ایک ایک معاملے سے ہے.....ورنہ اگر ہدایت یافتگی کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ انسان توحید، رسالت اور آخرت کا اقرار کرے اور نماز روزے کی پابندی اختیار کرے، جیسا کہ تنگ نظر لوگ سمجھے بیٹھے ہیں، تو قرآن کے اس قول کے کوئی معنیٰ نہیں رہ جاتے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسا ایسا کرکے

ہدایت یاب ہو ہی چکے ہیں۔انھیں اب قرآن کیا ہدایت بخشے گا؟'' حاشیہ(۱۰)

اس طرح کے بعض اور بھی مقامات ہیں جہاں مولانا نے مسلمانوں کو ان کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے۔مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: حاشیہ(۶۸)

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ میرے استاذ اور مربی تھے۔۱۹۵۴ء میں ان سے تعارف حاصل ہوا اور ۱۹۵۶ء سے بہت ہی قریبی تعلق قائم ہوگیا۔ میں نے ان کی راہ نمائی اور نگرانی میں اپنا تصنیفی سفر شروع کیا۔ پندرہ برس تک مولانا کی صحبت و رفاقت اس طرح حاصل رہی کہ استفادہ اور تبادلۂ خیال میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں مولانا اپنے وطن پھول پور اعظم گڑھ منتقل ہو گئے۔اس کے بعد بھی انتقال کے وقت تک مولانا سے مسلسل ربط و تعلق رہا اور فائدہ اٹھانے کے مختصر اور طویل وقفے فراہم ہوتے رہے۔ میں نے 'تیسیر القرآن' سے طالب علمانہ استفادہ کیا ہے اور اس کے بعض خاص پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اسے اس تفسیر کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ کام زیادہ باصلاحیت افراد کر سکتے ہیں۔

اس وقت خوشی اس امر کی ہے کہ استاذ محترم کی تفسیر 'تیسیر القرآن' کو جو عملاً مسودہ کی شکل میں تھی، مولانا کے صاحب زادے برادرم ڈاکٹر رضوان احمد فلاحی سلمہ نے بڑی محنت سے اور جدید ڈھنگ سے مرتب کیا ہے۔مولانا نے جگہ جگہ اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے آیات و احادیث سے استشہاد کیا ہے۔انھوں نے ان کا صرف مفہوم بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔حوالے نہیں دیے ہیں۔رضوان احمد سلمہ نے ان کے حوالے فراہم کیے ہیں۔ اسی طرح جن دیگر کتب سے تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے ان کے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں۔مولانا نے مختلف آیات پر بعض سوالات کے جوابات میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اسی طرح قرآن ہی سے متعلق مضامین بھی لکھے ہیں، بعض وضاحتیں مولانا کی تصنیفات میں ملتی ہیں، ان سب کو رضوان احمد سلمہ نے ضمیموں کی شکل میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔ اب یہ کتاب بالکل جدید طرز پر ہمارے سامنے آرہی ہے۔ اللہ عزیز موصوف کو جزائے خیر دے اور مزید علمی خدمت کی توفیق عنایت کرے۔

○